اپنے اندر سچائی، محنت اور ایثار کے اوصاف پیدا کرو

از

سیدنا حضرت میرزا بشیرالدین محمود احمد
خلیفۃ المسیح الثانی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ نَحۡمَدُہٗ وَ نُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

اپنے اندر سچائی، محنت اور ایثار کے اوصاف پیدا کرو

مجلس خدام الاحمدیہ مرکزیہ سے خطاب

(فرمودہ ۱۲؍فروری ۱۹۵۱ء بمقام ربوہ)

تشہّد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:

''سال دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو وہ سال ہوتا ہے جو کسی جماعت کی ابتداء یا کسی کام کے جاری ہونے کے وقت سے بارہ مہینے گزرنے کے بعد شروع ہوتا ہے اور ایک وہ سال ہوتا ہے جو شمسی یا قمری سالوں کے اصول پر شروع ہوتا ہے۔ قمری سال تو بدلتا رہتا ہے لیکن شمسی سال ہمیشہ یکم جنوری کو شروع ہوتا ہے۔ آج جب مجھ سے خواہش کی گئی کہ مَیں خدام الاحمدیہ کو سالِ رواں کے متعلق بعض ہدایات دوں تو مَیں نے یہ بات مان تو لی لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ یہ کونسا سالِ رواں ہے جس کے متعلق مجھ سے بعض نصائح اور ہدایات حاصل کرنے کی خواہش کی گئی ہے اِس پر مجھے بتایا گیا کہ مجلس خدام الاحمدیہ کا قیام چونکہ ۴؍فروری کو ہؤا تھا اس لئے اِس مہینہ سے مجلس خدام الاحمدیہ کے نئے سال کی ابتدا ہوتی ہے۔ ورنہ شمسی یا قمری اصول کے مطابق یہ کوئی نیا سال شروع نہیں ہؤا۔

نصیحت ہمیشہ اس شخص کے لئے مفید اور کارآمد ہوتی ہے جو اُسے قبول کرتا اور اُس پر عمل کرتا ہے۔ باقی لوگوں کے لئے اس کا عدم اور وجود برابر ہوتا ہے۔ چند ماہ ہوئے خدام الاحمدیہ کا سالانہ اجتماع ہؤا تھا اور اُس موقع پر مَیں نے جماعت کے نوجوانوں کو

بہت سی مفید باتوں کی طرف توجہ دلائی تھی چونکہ میرے پاس امتحان کا کوئی ذریعہ موجود نہیں اِس لئے مَیں نہیں جانتا کہ میری نصائح کا کیا اثر ہؤا اور عمل میں کیا تبدیلی پیدا ہوئی اور جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ پہلی نصائح کا کیا اثر ہؤا اور ان کے نتیجہ میں اعمال میں کیا تبدیلی پیدا ہوئی۔ اُس وقت تک مزید نصائح کی طرف انسان کی توجہ کم ہوتی ہے اور مزید نصائح چنداں مفید بھی نہیں ہوتیں بلکہ بسا اوقات نصائح کی زیادتی قوم کی سُستی اور غفلت کا موجب ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جو چیز بار بار سامنے آتی ہے، جہاں وہ بار بار بیداری پیدا کرنے کا موجب ہو جاتی ہے وہاں بعض دفعہ وہ اپنی کثرت کی وجہ سے غفلت کا موجب بھی ہو جاتی ہے۔ پس مَیں نہیں سمجھتا کہ نوجوانوں میں نئی نصائح کے متعلق کیا کیفیت پیدا ہوئی ہے۔ کیونکہ مَیں اِس حقیقت سے ناواقف ہوں کہ میری پہلی نصائح نے کیا اثر کیا تھا۔

بہرحال نتیجہ کا پیدا نہ ہونا جہاں ایک صحیح رائے قائم کرنے سے انسان کو محروم کر دیتا ہے وہاں اِس بات کا کافی موجب نہیں ہوتا کہ نصائح کے سلسلہ کو ترک کر دیا جائے۔ اس لئے مَیں نئے سال کے لئے جماعت کے نوجوانوں کو اختصار کے ساتھ چند امور کی طرف توجہ دلا دیتا ہوں۔

جو نصائح کی جاسکتی ہیں وہ تو سینکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں ہوں گی اور پھر وہ مختلف حالات میں بدلتی بھی رہتی ہیں مگر اِس زمانہ میں سب سے بڑی ضرورت سچائی کی ہے۔ انبیاء نے اس پر خاص زور دیا ہے اور انسانی اخلاق کا یہ ایک بنیادی حصّہ ہے۔ سچائی اور راستی پر کوئی ایسا وقت نہیں آیا جب اِس کی ضرورت نہ سمجھی گئی ہو بلکہ کفّار کے نزدیک بھی یہ چیز بڑی قیمتی سمجھی جاتی تھی اور شاید ہی کسی زمانہ میں اِسے ترک کرنا جماعتی اور سیاسی طور پر تسلیم کیا گیا ہو۔ مگر اِس زمانہ میں سیاسی اور قومی مفاد کے لئے جھوٹ کو جھوٹ سمجھا ہی نہیں جاتا بلکہ اسے ایک نہایت ضروری چیز قرار دیا جاتا ہے۔ اور یہ مرض اس قدر پھیل گیا ہے کہ ہمارے مُلک میں لوگ بڑے اطمینان کے ساتھ قسمیں کھا کھا کر جھوٹ بولتے ہیں اور ساتھ ہی اِس بات پر ناراض بھی ہوتے ہیں کہ ہمارے اِس جھوٹ کو

سچ تسلیم کیوں نہیں کیا جاتا۔ عدالتوں میں پہلے یہ رواج تھا کہ گواہ کے ہاتھ میں قرآن کریم دے کر اُس سے قسم لیتے تھے اور اِس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ قرآن کریم میں جو وعید نازل ہوئے ہیں اُنہیں مدنظر رکھتے ہوئے مَیں قَسم کھاتا ہوں اور اگر میری قسم جھوٹی ہو تو مذکورہ وعید اور سزائیں مجھے ملیں لیکن اِن گواہوں میں سے کئی ایسے ہوتے تھے جو قسم کھا کر بھی جھوٹ بولتے تھے۔

مرزا سلطان احمد صاحب مرحوم جو ہمارے بڑے بھائی تھے اور ای۔اے سی تھے وہ اپنا تجربہ سُنایا کرتے تھے کہ جتنا کوئی قرآن کریم ہاتھ میں لے کر جوش سے گواہی دیتا تھا میرے تجربہ میں اُتنا ہی وہ جھوٹا ہوتا تھا۔ وہ ایک لطیفہ سُنایا کرتے تھے کہ ایک شخص جو میرا اچھا واقف تھا اُس کا مقدمہ میرے سامنے پیش ہوا۔ وہ کہنے لگا مجھے کوئی اور تاریخ دی جائے کیونکہ جو گواہ مَیں نے پیش کرنے تھے، وہ فلاں فلاں وجہ سے حاضر نہیں ہو سکتے۔ مَیں نے ہنس کر کہا مَیں تو تمہیں عقل مند اور ہوشیار آدمی خیال کرتا تھا لیکن اب میری طبیعت پر یہ اثر ہوا ہے کہ تم بے وقوف ہو۔ وہ کہنے لگا کیوں؟ مَیں نے کہا گواہوں کے لئے جگہ اور وقت کی کیا ضرورت ہے۔ اگر تمہاری جیب میں کچھ ہے تو روپیہ اٹھنّی دے کر بعض آدمی گواہی کے لئے لے آؤ۔ چنانچہ وہ باہر چلا گیا اور عملی طور پر تھوڑی دیر میں ہی کچھ گواہ لے آیا۔ گواہی لیتے ہوئے مَیں ہنستا بھی جاؤں اور مذاق بھی کرتا جاؤں۔ وہ لوگ قرآن کریم سر پر رکھ کر اور قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ واقعہ یُوں ہوا ہے۔ حالانکہ تھوڑی دیر ہوئی مَیں نے خود مدعی کو اِس غرض کے لئے باہر بھیجا تھا کہ وہ کچھ دے دلا کر چند گواہ لے آئے۔ جب وہ گواہی دے چکے تو مَیں نے اُنہیں پکڑا اور کہا تم بڑے کذاب ہو، تمہیں واقعہ کا علم ہی نہیں لیکن محض چند ٹکوں کی وجہ سے تم اتنا جھوٹ بول رہے ہو کہ قرآن کریم کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ اب جس قوم کی یہ حالت ہو اُس کا یہ کہنا کہ ہم کامیاب کیوں نہیں ہوتے بالکل غلط بات ہے۔ دُنیا میں وہی قومیں جیتا کرتی ہیں جن میں صداقت ہوتی ہے۔ مَیں عیسائی دُنیا کو دیکھتا ہوں کہ اُنہوں نے مشق کے ساتھ اپنے اندر سچائی کی اِتنی عادت پیدا کر لی ہے کہ جہاں حکومت کی خاطر وہ ہر قسم کا جھوٹ بول لیتے

ہیں وہاں جب ذاتیات کا سوال آتا ہے تو وہ جھوٹ نہیں بولتے۔ امریکہ کا کیریکٹر زیادہ اچھا ثابت نہیں ہؤا۔ امریکہ کا کیریکٹر کمزور ہے۔ کیونکہ اُنہوں نے جلد ترقی کی ہے اِس لئے وہ اپنا کیریکٹر نہیں بنا سکا لیکن یورپ نے آہستہ آہستہ ترقی کی ہے اور اِس نے اپنا کیریکٹر بنالیا ہے۔ اسی طرح کسی زمانہ میں ایک مسلمان کا کیریکٹر ایسا تھا کہ وہ جو بات کہتا تھا ٹھیک ہوتی تھی اور جب تک ہماری جماعت بڑھی نہیں تھی اُس وقت تک اِس کا بھی یہی حال تھا۔ احمدی کوئی بات کہہ دے لوگ اسے صحیح تسلیم کر لیتے تھے اور کہتے تھے احمدی جھوٹ نہیں بولتے تھے۔

جھنگ کا ہی ایک واقعہ ہے یہاں ایک دوست احمدی ہوئے تھے جن کا نام مغلہ تھا۔ ان کے تمام رشتہ دار اُن کے سخت مخالف ہو گئے۔ اِس علاقہ کے لوگ چوری کو ایک فن سمجھتے ہیں اور پھر اِس پر فخر کرتے ہیں۔ چنانچہ جتنا بڑا کوئی چور ہوگا اُتنا ہی وہ چوروں میں معزز ہوگا۔ مثلاً کہا جائے گا فلاں آدمی بڑا معزز ہے اِس لئے کہ فلاں موقع پر اِس نے اتنی بھینسیں نکال لیں یا فلاں آدمی بہت معزز ہے اِس لئے کہ اُس نے اتنی گائیں نکال لیں اور پھر چوروں میں اِس حد تک نظام قائم ہوتا ہے کہ ہر علاقہ میں جو چند ضلعوں یا چند تحصیلوں پر مشتمل ہوتا ہے، علاقہ کے سب چور اُس کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں اور مالِ مسروقہ میں سے اُس کا حصّہ نکالتے ہیں۔ مغلہ ایسے ہی بالا دستوں میں سے ایک تھے جو بعد میں احمدی ہو گئے اور چوری سے اُنہوں نے توبہ کر لی۔ اُنہوں نے بتایا کہ علاقہ کے چور مال مسروقہ کا پانچواں دسواں یا بارھواں حصّہ میرے گھر پر لاتے تھے اور وہ سُنایا کرتے تھے کہ چوروں کے اندر ایسا نظام موجود ہے کہ بعض چوری کی ہوئی چیزوں کو دو دو تین تین سَو میل تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ ہر ایک جگہ کا اڈہ مقرر ہوتا ہے اور پہلے سے ہی یہ طے ہوتا ہے کہ اگر کوئی مسروقہ چیز مشرق کے کسی علاقہ کی طرف نکالنی ہے تو اتنے میل پر فلاں آدمی کو دے آؤ اور اگر مغرب کو مال نکالنا ہے تو چھ سات میل پر ایک دوسرے آدمی کو دے آؤ۔ اِسی طرح شمال اور جنوب میں ایک ایک آدمی مقرر ہوتا ہے۔ چور مخصوص حالات کے مطابق یہ فیصلہ کرتا ہے کہ مال فلاں طرف نکالا جائے۔ مثلاً اگر وہ دیکھتا ہے

کہ جس کے ہاں چوری کی ہے اُس کی رشتہ داریاں مشرق میں ہیں تو وہ مسروقہ مال مغرب کی طرف بھیج دے گا اور اگر رشتہ داریاں مغرب میں ہیں تو وہ اسے مشرق کی طرف بھیج دیتا ہے۔ اِسی طرح اگر اس کی رشتہ داریاں شمال کی طرف ہیں تو وہ مال جنوب کی طرف بھیج دے گا اور اگر رشتہ داریاں جنوب کی طرف ہیں تو وہ مال شمال کی طرف بھیج دے گا مثلاً بیکانیر گورداسپور سے کتنی دُور تھا لیکن ہمارے علاقہ کا مسروقہ مال بیکانیر تک جاتا تھا۔

پھر چوروں میں اِس قسم کا نظام ہوتا ہے کہ مثلاً ایک شخص اگر کوئی جانور چوری کرتا ہے تو وہ حالات کے مطابق اُسے دس بارہ میل پر کسی مقررہ اڈے پر پہنچا دے گا اور اُسے مثلاً دسواں حصّہ قیمت کا مل جاتا ہے گا۔ پھر دوسرا آدمی اُسے دوسرے اڈے تک پہنچا دے گا اور اُسے دسواں حصّہ قیمت کا مل جائے گا۔ اِس طرح وہ ایک عام اندازہ لگا کر قیمت کے حصّے کرتے جائیں گے اور آخری وقت اُسے بیچ کر اپنا حصّہ پورا کرے گا۔

ایک دفعہ سکھوں نے میری کچھ گھوڑیاں چُرا لیں اور پولیس نے میرے خیال میں اُنہیں تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن چونکہ پولیس والے ایسے معاملات میں مجرموں سے کچھ لے کر کھا پی بھی لیتے ہیں اِس لئے وہ سفارش لے آئے کہ اُنہیں معاف کر دیں اور اپنی رپورٹ واپس لے لیں یہ لوگ گھوڑیاں واپس دے دیں گے۔ اِن کا خیال تھا کہ اگر انہوں نے معاف کر دیا اور پولیس سے اپنی رپورٹ واپس لے لی تو بعد میں گھوڑیاں غائب کر دی جائیں گی۔ مَیں نے کہا مَیں ایسا نہیں کروں گا۔ ہمارے وہ دوست میرے پاس پہنچے اور اُنہوں نے کہا مَیں نے سُنا ہے کہ سکھوں نے آپ کی گھوڑیاں چُرا لی ہیں۔ یہ لوگ سیدھی طرح تو گھوڑیاں واپس نہیں کریں گے آپ اجازت دیں کہ مَیں ان کی گھوڑیاں چوری کروا دوں اِس طرح وہ آپ کی گھوڑیاں واپس کر دیں گے۔ مَیں نے کہا آپ نے توبہ کی ہوئی ہے آپ اپنی توبہ پر قائم رہیں گھوڑیوں کی خیر ہے۔ اتفاقاً وہی چور جنہوں نے میری گھوڑیاں چُرائی تھیں ایک اَور مقدمہ میں گورداسپور عدالت میں پیش ہوئے۔ مسٹر اوگلی ڈی سی کی عدالت میں وہ چور پیش ہوئے۔ وہ احمدیوں کے اخلاق کے

بہت مداح تھے۔ کسی شخص نے اُنہیں بتایا کہ یہ لوگ بہت سخت ہیں۔ اُنہوں نے قادیان کے مرزا صاحب کی گھوڑیاں بھی چُرا لی تھیں۔ جس مقدمہ میں وہ چور عدالت میں پیش ہؤا تھا اُس کی سزا دو سال سے سات سال تک ہوسکتی تھی لیکن ڈی۔سی نے مجرم کو مخاطب کر کے کہا تمہارے جُرم اور حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے مَیں تمہیں دو سال کی سزا دیتا ہوں اور پانچ سال مرزا صاحب کی گھوڑیاں چُرانے کی سزا دیتا ہوں لیکن خدا تعالیٰ کی نظر میں یہ سزا بھی کم تھی۔ سات سال کی قید کے بعد جب وہ چور رہا ہو کر گھر آیا تو اُس کی غیر حاضری میں اُس کی بیوی آوارہ ہو چکی تھی۔ اُس نے اُسے قتل کر دیا اور خود پھانسی پر چڑھ گیا۔

غرض جب کوئی شخص سچائی کے ساتھ کام کرتا ہے تو خدا تعالیٰ خود اُس کا بدلہ لیتا ہے۔ مُغلہ جب احمدی ہوئے تو اُنہوں نے قومی عادت یعنی چوری کو ترک کر دیا اور جھوٹ بولنا بھی چھوڑ دیا کیونکہ یہ ابتدائی جُرم ہوتا ہے۔ اُن کے ماں باپ اور دوسرے رشتہ داروں نے ان کا بائیکاٹ کر دیا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ مُغلہ کافر ہو گیا ہے لیکن بعد میں پتہ لگا کہ اُن کا لڑکا کافر ہو کر سچ بولنے لگ گیا ہے اور چوری بھی اُس نے چھوڑ دی ہے۔ چور چوریاں کرتے تھے اور پولیس اور دوسرے لوگ ان کا تعاقب کرتے تھے۔ عدالتوں میں بات اَور ہوتی ہے اور انسان وہاں جھوٹ بول کر گزارہ کر لیتا ہے لیکن برادری یا پنچائت میں یہ بات مشکل ہوتی ہے کہ کوئی اپنا قصور چُھپالے۔ عدالتوں میں بتانے والے لوگ نہیں ہوتے اس لئے مجرم جو چاہے بیان دے دے۔ لیکن برادری اور پنچایت میں وہ اگر جھوٹ بولے گا تو فوراً بعض واقف لوگ کھڑے ہو جائیں گے جو اُس کا جھوٹ ظاہر کر دیں گے۔

غرض جب چور چوریاں کر کے گھروں میں واپس آتے تو تعاقب کرنے والے بھی پہنچ جاتے اور کہتے تم نے ہمارا مال چُرایا ہے لیکن وہ کہتے نہیں اور اکثر قرآن کریم بھی اُٹھا لیتے۔ لوگ چوِنّی اُٹھنّی پر قسمیں کھا لیتے ہیں پھر بھینس یا گائے پر وہ قرآن کریم کیوں نہ اُٹھاتے۔ تعاقب کرنے والے چوروں کی قسم پر اعتبار نہ کرتے اور کہتے لاؤ مُغلے

کو۔ اگر وہ کہہ دے کہ تم نے مال چوری نہیں کیا تو ہم مان لیں گے۔ وہ وہاں پہنچتے اور مُغلے سے کہتے تم گواہی دو کہ ہم نے ان کا مال نہیں چُرایا۔ وہ کہتے ہیں کیسے کہوں کہ تم نے مال نہیں چُرایا کیا تم فلاں مال چُرا کر نہیں لائے؟ اُن کے بھائی کہتے۔ کیا تم ہمارے بھائی ہو یا ان کے بھائی وہ کہتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تم میرے بھائی ہو لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ مَیں جھوٹی گواہی دوں۔ وہ انہیں مارتے، پیٹتے اور سمجھتے کہ اب مار کھا کر اسے عقل آ گئی ہو گی لیکن وہ دوبارہ یہی کہہ دیتے کہ تم نے چوری کی ہے۔

میاں مُغلہ سُنایا کرتے تھے کہ جب کوئی چوری کا معاملہ میرے سامنے آتا تو مَیں خیال کرتا کہ اگر سچ بولا تو میرے بھائی اور دوسرے رشتہ دار مجھے ماریں گے اور اگر جھوٹ بولا تو گناہ گار ہو جاؤں گا اس لئے مَیں کہہ دیتا مَیں تو آپ کے نزدیک کافر ہوں پھر آپ میری گواہی کیوں لیتے ہیں؟ وہ کہتے تم کافر تو ہو لیکن بولتے سچ ہو۔ پھر مَیں کہتا میرا اِس معاملہ میں کیا واسطہ ہے؟ لیکن وہ میرا پیچھا نہ چھوڑتے۔ میرے بھائی اور رشتہ دار مجھے چُٹکیاں کاٹتے اور مجبور کرتے کہ میں جھوٹ بول دوں لیکن مَیں کہتا تم لائے تو تھے فلاں بھینس پھر مَیں جھوٹ کیسے بولوں۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ مجھے خوب مارتے۔ وہ دوست تنگ آ کر قادیان آ گئے اور ایک احمدی انجینئر خان بہادر نعمت اللہ خاں صاحب مرحوم نے جنھوں نے ربوہ کے قریب دریائے چناب پر پُل بنایا تھا انہیں ملازم کرا دیا۔

غرض بعض ایسی عادات ہوتی ہیں جن کا ترک کرنا آسان نہیں ہوتا۔ جس طرح جھنگ کے لوگوں میں چوری کی عادت ہے نوجوان بعض دفعہ جھوٹ کی پرواہ نہیں کرتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر جھوٹ بول لیا تو کیا ہؤا۔ حالانکہ جھوٹ فطرت کے خلاف ہے۔ جھوٹ اِس چیز کا نام ہے کہ کان سے جو کچھ سُنا ہو اس کے متعلق کہہ دیا جائے کہ مَیں نے نہیں سُنا۔ آنکھ نے جو کچھ دیکھا ہو اِس کے متعلق کہہ دیا جاہے کہ مَیں نے نہیں دیکھا۔ ہاتھ نے ایک چیز اُٹھائی ہو لیکن انسان کہہ دے کہ میرے ہاتھ نے فلاں چیز نہیں اُٹھائی۔ ایک شخص کے پاؤں ایک طرف چلیں لیکن وہ کہہ دے کہ میرے پاؤں اِس طرف نہیں چلے۔ گویا انسان کسی غیر کی نہیں بلکہ اپنی تردید آپ کرتا ہے۔ جو چیز اُس نے خود دیکھی ہے اُس کے متعلق

کہہ دیتا ہے کہ مَیں نے نہیں دیکھی۔ جو چیز اس نے خود سُنی ہے اس کے متعلق کہہ دیتا ہے کہ مَیں نے نہیں سُنی۔ جو چیز وہ خود چکھتا ہے اس کے متعلق وہ کہہ دیتا ہے کہ فلاں چیز مَیں نے نہیں چکھی۔ اُس کے ہاتھوں نے ایک چیز اُٹھائی ہوتی ہے لیکن وہ کہہ دیتا ہے کہ مَیں نے فلاں چیز نہیں اُٹھائی۔ گویا وہ اپنی تردید آپ کرتا ہے اور اس سے زیادہ فطرت کے خلاف اور کیا چیز ہوگی۔ شُبہ ایسی چیز پر ہوسکتا ہے جس میں قیاس کا دخل ہو حواسِ خمسہ کے افعال پر شُبہ نہیں کیا جا سکتا اور حواسِ خمسہ کے افعال کے خلاف بات کہنے کو جھوٹ کہتے ہیں۔ جو شخص حواسِ خمسہ کی تردید کرتا ہے وہ گویا اپنی زبان، ہاتھ، ناک اور کان کی تردید کرتا ہے اور پھر وہ اِس میں سب سے زیادہ لذت محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے خلاف آپ گواہی دے رہا ہے۔ ایک انسان کے ہاتھ ایک چیز پکڑتے ہیں اور وہ کہتا ہے مَیں نے فلاں چیز نہیں پکڑی تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں کو کہتا ہے کہ تم نے فلاں چیز نہیں پکڑی۔ ایک چیز اُس کی زبان چکھتی ہے لیکن وہ کہتا ہے مَیں نے فلاں چیز نہیں چکھی تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی زبان سے کہتا ہے کہ تم نے فلاں چیز نہیں چکھی۔ یا اُس کے کان ایک بات سُنتے ہیں اور وہ اس کا انکار کر دیتا ہے تو اِس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے کانوں سے کہتا ہے کہ تم نے فلاں بات نہیں سُنی۔ اب یہ کتنی مضحکہ خیز اور عجیب بات ہے مگر لوگ اس کی پرواہ نہیں کرتے اور واقعہ آنے پر جھوٹ بول دیتے ہیں۔ اب اگر مَیں یہ کہوں کہ تم جھوٹ بولتے ہو یا نہیں؟ تو تم یہ بات نہیں سمجھ سکو گے۔ لیکن مَیں یہ سوال اور طرح کرتا ہوں۔

(اس موقع پر حضور نے خدام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ خادم کھڑے ہو جائیں جو یہ سمجھتے ہوں کہ میرے سارے دوست سچ بولتے ہیں۔ مگر اِس پر کوئی نوجوان کھڑا نہ ہؤا۔ تقریر جاری رکھتے ہوئے حضور نے فرمایا:-)

دیکھو یہ مرض اتنا پھیل چُکا ہے کہ تم مَیں سے ایک خادم بھی ایسا کھڑا نہیں ہؤا جو کہہ سکے کہ میرے سارے دوست سچ بولتے ہیں حالانکہ اِس کا علاج آسان تھا کہ جب تمہارا کوئی دوست جھوٹ بولتا تو اُسے کہتے کہ آج سے مَیں تمہارا دوست نہیں اور آج سے مَیں

تمہارے ساتھ کلام نہیں کروں گا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ آج تم بڑی دلیری سے کھڑے ہو جاتے اور کہتے میرے سب دوست سچ بولتے ہیں کیونکہ جب تمہارے کسی دوست نے جھوٹ بولا تھا اُس وقت سے وہ تمہارا دوست نہیں رہا تھا۔ اگر تم ایسا کرتے تو تم خود بھی اور تمہارا وہ دوست بھی سچ بولنے لگ جاتا۔ اگر تمہاری دوستی کی اُس کے نزدیک کوئی قیمت ہوتی تو وہ کہتا مَیں اِس کا دوست رہنا چاہتا ہوں اس لئے مَیں آئندہ ہمیشہ سچ بولوں گا اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ تم بھی سچ بولنے لگ جاتے کیونکہ جب تم اپنے دوست سے سچ بُلواتے تو پھر وہ دوست بھی تمہیں مجبور کرتا کہ تم سچ بولو اور اس طرح تمہیں وہ قیمت مل جاتی جس کا ہیرے جواہرات بھی مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بہرحال اگر تم نے پہلے اِس طریق پر عمل نہیں کیا تو اب اِس پر عمل کرنا شروع کر دو۔ یہ کہنا فضول ہوگا کہ تم جھوٹ نہ بولو کیونکہ اگر مَیں ایسا کہوں تو تمہارے لئے آگے قدم اُٹھانا مشکل ہو جائے گا۔ مَیں کہتا ہوں جھوٹ بولنے والا تمہارا دوست نہ ہو اِس طرح تم خود سچ بولنے لگ جاؤ گے۔ تم اگر ایک دوست کو یہ کہو گے کہ اگر تم نے جھوٹ بولا تو میری تمہاری دوستی ٹُوٹ جائے گی تو لازماً تمہارا دوست بھی یہ فیصلہ کرلے گا کہ اگر تم نے جھوٹ بولا تو اُس کی دوستی بھی ٹوٹ جائے گی اور جب بھی تم جھوٹ بولو گے تو وہ کہے گا میاں! تم کیا کر رہے ہو؟

غرض سچ ایک قیمتی چیز ہے اور پھر کوئی مشکل بھی نہیں آسان ترین ہے جو کام ہاتھ نے کیا ہے اِس کے متعلق یہ کہہ دینا کہ ہاتھ سے یہ کام کیا ہے اِس میں بوجھ کیا ہے۔ آنکھ نے جو کچھ دیکھا اُس کے متعلق یہ کہہ دینا کہ آنکھ نے فلاں چیز دیکھی ہے اِس میں کونسی مشکل ہے۔ کانوں نے ایک بات سُنی ہے۔ اب اس کے متعلق یہ کہہ دینا کہ کانوں نے فلاں بات سُنی ہے اور اِس کو دُہرا دینا کون سی مشکل بات ہے۔ یہاں کوئی فقرہ نہیں بنانا صرف ایک بات کو دُہرا دینا ہے مثلاً عربی زبان ہے آپ لوگ اسے بڑی مشکل سے سیکھ سکتے ہیں لیکن ایک دو سال کے بچے کو بھی کہو ذَھَبَ ثُ تو وہ اِسے دُہرا دے گا۔ گویا جو فقرہ بنانا تم ساتویں، آٹھویں جماعت میں سیکھو گے وہ تم ایک سال کے بچہ سے بھی بن سکتے ہو۔ تم کہو گے ذَھَبَ ثُ تو وہ فوراً دُہرا دے گا۔ اِسی طرح سچ نقل کرنے کو کہتے ہیں یعنی جب تم سچ

بولتے ہو تو ایک بات کو دُہرا دیتے ہو۔ ہاتھ سے ایک کام کرتے ہو تو تم کہتے ہو ہاتھ فلاں کام کرتے ہیں۔ آنکھیں دیکھتی ہیں تو تم کہتے ہو آنکھیں دیکھتی ہیں۔ کان سُنتے ہیں تو تم کہتے ہو کان سُنتے ہیں۔ زبان چکھتی ہے تو تم کہتے ہو زبان چکھتی ہے اور اِسی کو سچ کہتے ہیں لیکن یاد رکھو سچ کے یہ معنے نہیں کہ آنکھ نے جو کچھ دیکھا ہے وہ تم ضرور کہہ دو۔ قرآن کریم بعض باتوں کے بیان کرنے سے منع کرتا ہے۔ پس اگر کوئی شخص ان کو بیان کرتا ہے تو وہ سچ نہیں بولتا بلکہ فتنہ و فساد پھیلاتا ہے۔ سچ کے معنی صرف یہ ہیں کہ اگر تم کوئی بات کہو تو ضرور سچ کہو یہ نہیں کہ تم وہ بات ضرور کہو۔ فرض کرو تم نے ایک لڑکے کو کسی دوسرے لڑکے کو مارتے دیکھا۔ اب اگر ہیڈ ماسٹر تمہیں بُلا کر پوچھتا ہے کہ کیا اس لڑکے نے فلاں لڑکے کو مارا تھا؟ تو تم سچی بات بتا دو خواہ مارنے والا تمہارا گہرا دوست ہی ہو۔ لیکن اگر تم خود ہیڈ ماسٹر کے پاس چلے جاتے ہو اور اُسے کہتے ہو کہ مَیں نے فلاں لڑکے کو مارتے ہوئے دیکھا ہے تو یہ سچ نہیں بلکہ فتنہ اور شرارت ہے۔ جب ہیڈ ماسٹر خود بُلا کر پوچھے اور تم کہو مَیں نے فلاں لڑکے کو مارتے ہوئے دیکھا ہے تو یہ سچ ہوگا لیکن اگر تم خود ہیڈ ماسٹر کے پاس چلے جاتے ہو اور کہتے ہو مَیں نے فلاں لڑکے کو مارتے ہوئے دیکھا ہے تو یہ فتنہ ہوگا اور اسلام اس سے منع کرتا ہے۔ ہر نیکی کسی عمل پر گناہ بن جاتی ہے اور ہر بدی کسی عمل پر نیکی بن جاتی ہے۔ مثلاً عفو کرنا بھی اسلام نے جائز رکھا ہے۔ فرض کرو اس لڑکے نے واقعی طور پر کسی لڑکے کو مارا تھا لیکن بعد میں مار کھانے والا مارنے والے کو معاف کر دیتا ہے اور اپنے والدین یا بہن بھائیوں کو نہیں بتاتا تو یہ بہت بڑی نیکی ہے۔ اب اگر تم اس کے والدین کے پاس چلے جاتے ہو اور کہتے ہو فلاں لڑکے نے تمہارے لڑکے کو مارا ہے تو گو اس طرح تم ایک حقیقت بیان کرتے ہو لیکن تمہارا یہ حقیقت بیان کرنا فتنہ کا موجب بن جائے گا۔ وہ لڑکا مارنے والے کو معاف کر آیا تھا لیکن اس کے والدین یا اُستاد اگر تم ان کے پاس رپورٹ کرتے ہو تو اُسے سزا دیں گے۔

پس سچ اِس چیز کا نام نہیں کہ تم جو کچھ دیکھو وہ بیان کر دو۔ سچ اِس چیز کا نام ہے کہ جب تم سے گواہی لی جائے تو تم وہی بیان کرو جو واقع ہؤا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت نے

حکم دیا ہے کہ گواہی صرف قاضی لے کیونکہ بعض جگہیں ایسی ہوتی ہیں جہاں شریعت کہتی ہے کہ گواہی نہ لو۔ اب اگر گواہی لینے والا قاضی نہ ہو تو ہوسکتا ہے وہ کوئی ایسی بات پوچھ لے جس کے پوچھنے کی شریعت نے اجازت نہیں دی اور اس طرح فتنہ پھیل جائے۔ مثلاً ایک شخص کسی دوسرے شخص پر الزام لگاتا ہے کہ اس نے چوری کی تو اب چوری کرنا بے شک جُرم ہے لیکن قاضی کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اس کی بات مان لے اور فیصلہ کر دے کہ اس نے فی الواقعہ چوری کی ہے۔ قاضی کو فیصلہ کرنے کا اُسی وقت اختیار ہے جب الزام لگانے والا الزام کو گواہیوں سے ثابت کر دے۔ شریعت نے توبہ کا دروازہ کُھلا رکھا ہے اور توبہ کا دروازہ اُسی وقت کُھلا رہ سکتا ہے جب اِخفاء کا دروازہ کُھلا رہے۔ جب کسی جُرم کو چُھپانے کی اجازت نہیں تو پھر توبہ کا دروازہ بھی کُھلا نہیں۔ مثلاً اگر کسی نے دوسرے شخص کا کھانا اُٹھا لیا تو ہوسکتا ہے وہ ایسا کرنے میں معذور ہو اور خدا تعالیٰ نے اس پر پردہ ڈال دیا ہو یا ہوسکتا ہے خدا تعالیٰ مالک کو اپنے پاس سے بدلہ دے دے یا ہوسکتا ہے کہ کھانا کھا لینے کے بعد اسے یہ خیال آئے کہ مَیں نے بڑی غلطی کی ہے۔ اگر دو وقت کا پہلے فاقہ تھا تو ایک وقت کا فاقہ اور برداشت کر لیتا۔ وہ خدا تعالیٰ کے سامنے گڑگڑائے اور کہے خدایا! مَیں نے غلطی کی ہے تُو مجھے معاف کر دے اور خدا تعالیٰ نے اُسے معاف کر دیا ہو اور جس شخص کا کھانا اُس نے کھایا ہے وہ بھی صبر کر لے۔ لیکن اگر اسے کھانا کھاتے ہوئے کوئی دیکھ لیتا ہے اور وہ مالک کو کہہ دیتا ہے کہ فلاں نے تمہاری چوری کی ہے تو یہ سچ نہیں بلکہ فتنہ اور شرارت ہے۔ اس قسم کی شکایت اگر قاضی کے پاس جائے تو چونکہ وہ شریعت کا واقف ہوگا۔ وہ کہے گا دو گواہ لاؤ۔ اور اگر دو گواہ مل جاتے ہیں تو پتہ لگا کہ خدا تعالیٰ نے اس کی پردہ پوشی نہیں کی لیکن اگر وہ بغیر گواہوں کے اس کی بات کو مان لیتا ہے تو وہ خدا تعالیٰ کی پردہ پوشی کو توڑتا ہے۔ پس سچ کے یہ معنے نہیں کہ جو کچھ تم دیکھو اُسے ضرور بیان کرو اور نہ سچ کے یہ معنے ہیں کہ تم جو کچھ دیکھو اُسے ہر ایک کے سامنے بیان کرو۔ اگر غیر قاضی تم سے سوال کرتا ہے تو تم کہہ دو مَیں نہیں بتاتا۔ اِسی طرح اگر تم کسی شخص کو کوئی جُرم کرتے دیکھتے ہو تو تمہارا اُس پر پردہ ڈال دینا سچ کے خلاف نہیں۔ تمہارا

سچ کے خلاف فعل اُس وقت متصور ہو گا جب قاضی یا قائمقام قاضی جسے شریعت نے اپنے دائرہ میں گواہی لینے کا حق دیا ہے، تم سے دریافت کرے اور تم سچ نہ بولو۔ مثلاً تم سکول کے ساتھ تعلق رکھتے ہو تو اگر کسی لڑکے نے دوسرے لڑکے کو مارا یا اُس نے گالی دی یا سکول کی کوئی چیز اُٹھا لی تو مجسٹریٹ ہیڈ ماسٹر ہے۔ اگر وہ تمہیں بُلائے اور تم سے دریافت کرے کہ فلاں بات کیسے ہوئی تو تم ٹھیک ٹھیک واقعہ بیان کر دو لیکن اگر وہ تمہیں گواہی کے لئے نہ بُلائے تو خواہ وہ بات درست ہی ہو اس کا چُھپانا سچ کے خلاف نہیں بلکہ اس طرح تم صلح پسند بنتے ہو اور فتنہ سے دُور رہتے ہو۔

دوسری چیز محنت ہے یہ خُلق بھی ہمارے مُلک میں بہت کم پایا جاتا ہے اور مسلمانوں کی تباہی کا زیادہ تر موجب یہی تھا کہ اُن میں محنت کی عادت جاتی رہی تھی۔ جتنے وقت میں ہمارے نوجوان ایک چھوٹا اور ادنیٰ علم سیکھ سکتے ہیں وہ درحقیقت دُنیا میں چوٹی پر پہنچنے کا زمانہ ہوتا ہے۔ ہمارے نوجوان ۲۵، ۲۶ سال کی عمر میں کالج سے فارغ ہوتے ہیں لیکن دُنیا کے دوسرے ممالک کے لوگ اِس عمر میں چوٹی تک پہنچ جاتے ہیں۔ جس وقت ہمارے نوجوان کالجوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہوتے ہیں دوسرے ممالک کے لوگ اس وقت تک مُلک میں کافی شُہرت حاصل کر لیتے ہیں۔ اُن کے کام کا زمانہ پندرہ سولہ سال کی عمر سے شروع ہوتا ہے لیکن ہمارے نوجوان ۲۵، ۲۵ سال کی عمر تک ماں باپ کی کمائی پر پلتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کے اندر محنت کی عادت نہیں پائی جاتی۔ انہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ بزرگوں کا فرض ہے کہ وہ ہمیں کِھلائیں۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ ہمارا بھی کوئی فرض ہے۔

کہتے ہیں ایک بوڑھا شخص کوئی ایسا درخت لگا رہا تھا جو دیر سے پھل دیا کرتا ہے۔ ایران کا بادشاہ اس بوڑھے کے پاس سے گزرا اور اس سے دریافت کیا۔ بوڑھے تم ۷۰، ۸۰ سال کے ہو چکے ہو اور یہ درخت جب پھل دے گا اُس وقت تک تم مر چکے ہو گے تم یہ درخت کیوں لگا رہے ہو؟ بوڑھے نے جواب دیا۔ بادشاہ سلامت! آپ کیا کہہ رہے ہیں اگر یہی خیال ہمارے بزرگوں کے دلوں میں پیدا ہوتا اور وہ یہ درخت نہ

لگاتے تو ہم پھل کہاں سے کھاتے؟ اُنہوں نے درخت لگائے اور ہم نے پھل کھایا اب ہم یہ درخت لگائیں گے تو آنے والی نسل اِس کا پھل کھائے گی۔ اس بادشاہ کی عادت تھی کہ جب اسے کوئی بات پسند آتی تو وہ کہتا ''زِہ'' اور خزانچی کو حکم تھا کہ جب وہ کسی کام پر ''زِہ'' کہے تو وہ تین ہزار دینار کی تھیلی بطور انعام اسے دے دے۔ بادشاہ نے اس بوڑھے کے جواب پر کہا ''زِہ'' اور خزانچی نے تین ہزار دینار کی تھیلی فوراً بوڑھے کے سامنے رکھ دی اور کہا بادشاہ سلامت کو آپ کی بات بہت پسند آئی ہے اور اُنہوں نے آپ کو یہ رقم بطور انعام دی ہے۔ بوڑھے نے ہنس کر کہا۔ بادشاہ سلامت! آپ نے تو کہا تھا۔ بوڑھے تم کیا کر رہے ہو اس کا تمہیں کیا فائدہ؟ لوگ جلدی جلدی پھل دینے والے درختوں کا پھل بھی ایک عرصہ کے بعد کھاتے ہیں لیکن مَیں نے تو اس درخت کا پھل اسے لگاتے ہی کھا لیا۔ بادشاہ کو یہ بات پھر پسند آئی اور اس نے کہا ''زِہ'' اور خزانچی نے تین ہزار دینار کی ایک اور تھیلی اس بوڑھے کے سامنے رکھ دی۔ بوڑھا ہنسا اور اس نے کہا بادشاہ سلامت! اَور لوگ تو جلد سے جلد پھل دینے والے درخت کا پھل سال میں ایک دفعہ کھاتے ہیں اور مَیں نے اِس درخت کا پھل چند منٹوں میں دو دفعہ کھا لیا۔ بادشاہ نے کہا ''زِہ'' اور خزانچی نے تین ہزار دینار کی ایک اَور تھیلی اس بوڑھے کے سامنے رکھ دی۔ پھر بادشاہ نے خزانچی سے کہا یہاں سے جلدی چلو ورنہ یہ بوڑھا تو ہمارا سارا خزانہ لُوٹ لے گا۔

دُنیا میں یہی طریق ہوتا ہے کہ اگلا شخص نیچے کی طرف حرکت کرتا ہے لیکن ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔ نوجوان جونکوں کی طرح والدین کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں۔ انہیں یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ خود کمائیں۔ اپنے والدین کو کِھلائیں اور اپنی اگلی نسل کا خیال رکھیں۔ اس کے بِالمقابل یورپ کے لوگ پندرہ پندرہ سولہ سولہ سال کی عمر میں اپنی زندگیاں بدل لیتے ہیں۔

ایک دفعہ چوہدری ظفر اللہ خاں صاحب نے مجھے سُنایا کہ مَیں امریکہ گیا۔ اُن دنوں صوفی مطیع الرحمٰن صاحب بنگالی مرحوم وہاں تھے۔ اُنہوں نے ایک لڑکے کو میرے ساتھ لگا

دیا کہ وہ میرے ساتھ ساتھ رہے۔ اِس لڑکے کی عمر ۱۳، ۱۴ سال کی تھی۔ ایک دن جب مَیں سیر کے لئے باہر گیا تو مَیں نے اِس لڑکے سے اِس کے والد کا نام پوچھا۔ اِس نے ایک بڑے بنکر (Banker) کا نام لیا جو بہت مالدار تھا۔ تعلیم کے متعلق مَیں پہلے پوچھ چُکا تھا کہ وہ مڈل یا انٹرنس جو وہاں کی ابتدائی تعلیم ہوتی ہے پاس ہے۔ مَیں نے اِس لڑکے سے کہا۔ تمہارا باپ بہت امیر ہے تم کالج میں کیوں تعلیم حاصل نہیں کرتے جب سامان میسر ہیں تو تم نے اپنی تعلیم بیچ میں کیوں چھوڑ دی؟ وہ لڑکا غصّہ سے کہنے لگا مَیں اتنا بے غیرت نہیں کہ اپنے ماں باپ سے خرچ لے کر مزید تعلیم حاصل کروں۔ میرا والد مزید تعلیم کے لئے مجھے اخراجات دیتا تھا لیکن مَیں نے کہا مَیں نے پڑھنا ہوگا تو خُود محنت کر کے پڑھوں گا باپ کا احسان نہیں اُٹھاؤں گا لیکن ہمارے مُلک میں لڑکے کئی سال تک فیل ہوتے چلے جاتے ہیں اور اِنہیں اس بات کا احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہم اپنے والدین پر بوجھ بنے ہوئے ہیں۔ فیل ہونے پر وہ کہہ دیتے ہیں ہم نے تو بڑی محنت کی تھی اور اپنی کلاس میں ہوشیار تھے لیکن فلاں اُستاد کی جُوتی کو ایک دفعہ ہم نے ٹیڑھی نظر سے دیکھ لیا تھا اِس لئے اُستاد کی ہم سے دُشمنی ہوگئی اور اُس نے ہمیں فیل کر دیا۔

ایک دفعہ ایک احمدی دوست نے مجھے خط لکھا کہ میرا لڑکا قادیان میں پڑھتا ہے۔ عربی میں وہ اچھا ہوشیار تھا لیکن اُستاد نے اسے فیل کر دیا ہے۔ اگر وہ کمزور ہوتا تو مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن وہ عربی میں اچھا ہوشیار تھا مگر اُستاد نے پھر بھی اسے فیل کر دیا یہ بڑے ظلم کی بات ہے اور پھر اس قسم کی حرکتیں قادیان میں کی جاتی ہیں آپ اس طرف توجہ کریں۔ مَیں نے اِس لڑکے کے پرچے منگوائے تو یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ اس نے ۵۰ یا سَو نمبروں میں سے صرف دو یا اڑھائی نمبر حاصل کئے تھے اور یہ نمبر بھی اُستاد کے رحم و کرم کی وجہ سے اُس نے حاصل کر لئے تھے ورنہ میرے نزدیک وہ صفر کا مستحق تھا۔ مَیں نے اس دوست کو لکھا۔ افسوس ہے کہ آپ نے اس بارہ میں تقویٰ سے کام نہیں لیا۔ آپ کہتے ہیں میرا لڑکا اچھا ہوشیار تھا مَیں نے اس کے پرچے منگوائے ہیں اور خود دیکھے ہیں اِس کو زیرو (0) ملنا چاہیئے تھا لیکن پتہ نہیں کہ اُستاد کے اس کے ساتھ کیسے تعلقات

تھے کہ اس نے اُسے دو یا اڑھائی نمبر دے دیئے۔

غرض ہمارے مُلک کے لڑکے خود محنت نہیں کرتے اور جب فیل ہو جاتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم تو کلاس میں ہوشیار تھے اور محنت بھی خوب کی لیکن اُستاد کو ہم سے دُشمنی تھی اس لئے اس نے ہمیں فیل کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کا وہ حصّہ جو انہوں نے عملی رنگ میں گزارنا تھا حصولِ تعلیم میں گزر جاتا ہے۔ ہمارے مُلک میں اوسط عمر ۳۵ سال ہے۔ یورپ میں اوسط عمر ۴۵ سال ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے بڑی عمر نہیں ہو سکتی۔ بعض ۷۰، ۸۰ سال کی عمر کو بھی پہنچ جاتے ہیں لیکن جب اوسط نکالی جائے تو وہ یہی ۳۵ سال بنتی ہے اور اگر ۲۵، ۲۶ سال پڑھنے میں ہی لگا دے تو باقی کیا رہ گیا۔ حالانکہ ہر نوجوان کے اندر یہ احساس ہونا چاہئے کہ وہ جلد سے جلد تیاری کو ختم کرے اور پھر اپنی قوم اور مُلک کی خاطر کوئی کام کرے۔

پس تم زیادہ سے زیادہ محنت کی عادت ڈالو۔ جب تک تم محنت کی عادت نہیں ڈالو گے اس وقت تک یہ اُمید کرنا کہ تم کوئی مفید کام کر سکو گے، غلط ہے۔ کوئی مفید کام کرنے کے لئے ضروری ہے کہ زندگی کے عملی حصّے کو کام میں لگایا جائے۔ طاقت کا زمانہ یہی ہوتا ہے جس کو ہمارے نوجوان حصولِ تعلیم میں ضائع کر دیتے ہیں۔ عورتوں کے متعلق مشہور ہے۔ بیسی کھیسی یعنی عورت بیس سال کی ہوئی تو بوڑھی ہوئی۔ مرد کے کام کا وقت بھی بیس سے چالیس سال تک کا ہوتا ہے اور اگر اس میں سے ۲۵، ۲۶ سال تیاری پر لگا دیئے جائیں تو پھر آدھا کام ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ پڑھائی میں یا سکول میں اتنا وقت خرچ کر دیتے ہیں اُن کے ذہن کُند ہو جاتے ہیں اور کسی بڑے کام کرنے کی اُن میں طاقت ہی نہیں رہتی۔ جب کسی بڑے کام کے کرنے کا وقت آتا ہے تو ان کی طاقت کمزور ہو جاتی ہے۔ جن لوگوں نے کام کرنا ہوتا ہے وہ علم سے کام لیتے ہیں اور تھوڑے سے سرمایہ سے زیادہ کام کرنا جانتے ہیں۔ انہیں محنت کی عادت ہوتی ہے وہ جب کوئی بڑا کام کرنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں تو پھر علم اور دولت کا خیال نہیں کرتے کہ وہ کس قدر ہیں بلکہ وہ کام پر لگ جاتے ہیں اور دُنیا میں اپنا نام پیدا کر لیتے ہیں۔

جہاں تک مدرسہ کی تعلیم کا سوال ہے مَیں نے کئی دفعہ بتایا ہے کہ مَیں پرائمری کے امتحان میں بھی فیل ہؤا۔ مڈل کے امتحان میں بھی فیل ہؤا۔ پھر انٹرنس کا امتحان دیا تو اس میں بھی فیل ہؤا لیکن میری عمر ابھی ۱۷ سال کی تھی جب مَیں نے تشحیذ الاذہان جاری کیا اُس وقت یہ رسالہ سہ ماہی نکلتا تھا۔ بعد میں ماہوار کر دیا گیا یعنی ایک سال تک رسالہ سہ ماہی رہا اگلے سال ماہوار کر دیا گیا۔ لیکن تم میں کتنے خدام ہیں جن کو ۱۷ سال کی عمر میں کام کا احساس ہو چُکا ہو اور اُنہوں نے کوئی کام شروع کر دیا ہو۔ اگر کوئی ایسا نوجوان ہے جس نے ۱۷ سال کی عمر میں کام شروع کر دیا تھا تو کم از کم اسے اتنی تسلی ضرور ہوگی کہ وہ اگر ۳۰ سال کی عمر میں بھی فوت ہو جائے تو خدا تعالیٰ کے سامنے وہ یہ کہہ سکے گا کہ مَیں نے ۱۳ سال تو کام کر لیا لیکن اگر تم پڑھتے چلے جاتے ہو اور کام کرنے کا احساس تمہارے اندر پیدا نہیں ہوتا تو خدا تعالیٰ کے سامنے کیا کہو گے۔ اگر ۳۰ سال کی عمر میں تم میں سے کوئی خادم فوت ہو جائے تو وہ خدا تعالیٰ کے سامنے کیا کہے گا کہ اس کی قوم نے اس سے کیا فائدہ اُٹھایا۔ ماں باپ نے اس سے کیا فائدہ اُٹھایا۔ مذہب نے اس سے کیا فائدہ اُٹھایا۔ مُلک نے اس سے کیا فائدہ اُٹھایا۔ کیا وہ خدا تعالیٰ کے سامنے یہ کہے گا کہ مَیں ساری عمر ''ڈی او جی۔ ڈاگ (Dog) ڈاگ معنے کُتّا'' کا سبق دُہراتا رہا۔ خدا تعالیٰ سوال کرے گا کہ تم نے دُنیا میں کیا کام کیا؟ تو کیا تم یہ کہو گے ''ڈی او جی ڈاگ (Dog) ڈاگ معنے کُتّا''۔ یہ کوئی زندگی ہے۔ تم دُنیا میں پیدا ہوئے اور پھر مر گئے اور خدا تعالیٰ کے سامنے یہ کہنے لگے کہ مَیں ساری عمر یہی سبق دُہراتا رہا۔ خدا تعالیٰ کہے گا کہ تم بھی کُتّے ہی ہو اور کُتّے سے بھی بدتر ہو۔

یاد رکھو جلدی جلدی پڑھنا ہتھیار کا کام دیتا ہے لیکن ہمارے مُلک کے نوجوانوں کی مثال اُس شخص کی سی ہے جس کے گھر پر ڈاکو آئے اور اُنہوں نے گھر کی عورتوں پر ہاتھ ڈالا لیکن وہ ابھی چُھری تیار کر رہا تھا۔ بعد میں وہ چُھری تیار کر کے لے بھی آیا تو اُسے کیا فائدہ ہوگا۔

غرض تھوڑی سے تھوڑی مدت میں علم کو ختم کرنا اور اس سے فائدہ اُٹھانا چاہئے۔ ہمارا

ایک انٹرنس پاس لڑکا یا مولوی فاضل تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اِس قابل نہیں ہوتا کہ وہ انگریزی یا عربی بول سکے حالانکہ اُسے بہت سے ایسے مواقع میسّر آتے ہیں جن سے اگر وہ چاہے تو فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ کسی زمانہ میں عربی کے بڑے سے بڑے عالم بھی عربی نہیں بول سکتے تھے کیونکہ انہیں عربی بولنے کے مواقع میسّر نہیں آتے تھے۔ لیکن اب تو ہمارے پانچ سات آدمی ایسے ہوں گے جو عرب ممالک سے ہو آئے ہیں اور پھر عربی بولنے والے طالب علم بھی آتے رہتے ہیں انہیں ان سے گفتگو کرنے کا موقع مل سکتا ہے۔ انگریزی دانوں کو تو انگریزی بولنے کے مواقع کثرت سے ملتے ہیں لیکن عربی دانوں کو اگر عربی زبان میں کچھ بولنے کا موقع ملے تو ان کی حالت اُس شخص کی سی ہوگی جو ایک وزنی ٹرنک سر پر اُٹھائے جا رہا ہو۔ وہ اُس وقت پسینہ پسینہ ہو رہے ہوتے ہیں کیونکہ انہیں عربی بولنے کی عادت نہیں ہوتی۔ پس تمہیں علم سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ مثلاً عربی دانوں کو لے لو۔ جتنے طلباء ہمارے جامعۃ المبشرین میں پڑھتے ہیں۔ جہاں تک کورس کی تعلیم کا سوال ہے ان میں سے ایک بھی نہیں جس کی تعلیم مجھ سے دس گُنا زیادہ نہ ہو لیکن جتنا قرآن کریم کو مَیں سمجھتا ہوں اور اس کے معانی اور معارف بیان کر سکتا ہوں وہ اس کا $\frac{1}{10}$ فیصدی بھی بیان نہیں کر سکتے۔ گویا ان کی تعلیم مجھ سے دس گُنا زیادہ ہے لیکن علم $\frac{1}{10}$ سے بھی کم ہے کیونکہ وہ پڑھنے کے لئے علم سیکھتے ہیں استعمال کے لئے نہیں کتاب کا علم علم نہیں علم کتابیں پڑھنے کے بعد آتا ہے۔ ہم کتابیں پڑھتے ہیں اور بعد میں ان پر غور کرتے ہیں اور نتائج نکالتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ کتاب کے باغیچہ یا وادی میں گھاس یا پُھول نکلا ہے وہ گھاس یا پُھول اپنی جگہ پر قیمتی نہیں بلکہ ان کی قیمت اُس وقت بڑھتی ہے جب مالی ان سے ہار تیار کرتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم مالی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم وادی کے کنارے بیٹھے رہتے ہیں۔ ہم پڑھتے رہتے ہیں لیکن علم کا ''انیلسز'' اور استعمال نہیں سیکھتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہماری معلومات خراب ہوتی ہیں، ہماری دلیل ناقص ہوتی ہے۔ جو بات ہم دس بار بھی پڑھ چکے ہوں اُسے موقع پر چسپاں کرنا نہیں آتا اور وقت پر پتہ نہیں لگتا کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔

مجھے یاد ہے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمایا کرتے تھے کہ ۱۷، ۱۸ سال ہوگئے کہ ہم وفاتِ مسیح پر زور دے رہے ہیں لیکن ابھی تک جماعت کے بعض لوگ یہ نہیں سمجھے کہ یہ کیا مسئلہ ہے۔ وہ وفات مسیح کی ایک آیت لے لیں گے لیکن بیان کرتے وقت اُلٹ دلیل دے دیں گے مثلاً آپ فرماتے ہیں کہ یٰعِیْسٰٓی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ[۱] کی آیت سے لوگ اِس بحث میں پڑے رہتے ہیں کہ توفّی کے کیا معنے ہیں حالانکہ یہاں توفّی کے معنوں کا سوال نہیں۔ سوال مقام کا ہے۔ کوئی مقام سمجھ لو سوائے وفات کے معنوں کے اور کوئی معنے لگ نہیں سکتے۔ اَور معنے کرنے میں ہمیں آیت کے الفاظ کو آگے پیچھے کرنا پڑے گا۔ ہمارے دعویٰ کی بنیاد ایک تو یہ آیت ہے اور ایک آیت سورہ مائدہ کے آخر میں آتی ہے لیکن جو لوگ علم سے فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ وہ لفظی معنوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔

ہمارے ایک عالم تھے جو غیر احمدیوں میں بھی بڑے عالم سمجھے جاتے تھے لیکن انہیں علم کو استعمال کرنا نہیں آتا تھا۔ ایک جگہ وفات مسیح پر بحث ہوگئی۔ دوست انہیں لے گئے دوسرے عالم نے کہا قرآن کریم سے وفات مسیح ثابت نہیں ہوتی تو اُنہوں نے کہا قرآن کریم میں تیس آیات ہیں جن سے وفات مسیح ثابت ہوتی ہے۔ اُس نے کہا پھر ثابت کرو۔ اُنہوں نے ایک آیت پڑھی۔ مخالف نے اس پر اعتراض کیا بجائے اس کے کہ وہ اس اعتراض کا جواب دیتے اُنہوں نے کہا اچھا اسے چھوڑو دوسری آیت لو۔ پھر دوسری آیت پڑھی۔ مخالف مولوی نے اس پر بھی اعتراض کیا تو اُنہوں نے کہا اچھا اسے بھی چھوڑ دو یہاں تک کہ ۳۰ کی ۳۰ آیات ختم ہوگئیں۔

حکیم محمد حسین صاحب مرہم عیسیٰ جو لاہور کے ایک پرانے احمدی خاندان کے فرد ہیں جن کے گھروں کے پاس اب ہماری جامع مسجد بنی ہوئی ہے شروع شروع میں غیر مبائع ہو گئے۔ ان کے والد بہت پرانے احمدی تھے۔ میری عقیقے پر بھی وہ قادیان

آئے تھے۔ گو بارش کی وجہ سے وہ قادیان پہنچ نہ سکے۔ گویا اُس وقت سے ان کے والد کے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام سے تعلقات تھے۔ مرہم عیسیٰ صاحب پیغامی تو ہوگئے لیکن اُن کو مجھ سے ہمیشہ اُنس رہا۔ اعتراضات بھی کرتے تھے لیکن پرانی محبت کی وجہ سے انہوں نے تعلقات میں فرق نہیں آنے دیا۔ میں سفر پر کہیں جاتا تو عموماً یہ میرے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ ایک دفعہ فیروز پور میں میری تقریر ہوئی۔ مرہمِ عیسیٰ صاحب بھی وہاں آ پہنچے۔ وہ مولوی صاحب جن کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں وہ بھی وہیں تھے۔ میری طبیعت خراب تھی۔ جو نظارہ مجھے یاد ہے وہ یہ ہے کہ مَیں لیٹا ہؤا تھا کہ مرہمِ عیسیٰ صاحب نے اعتراضات کرنے شروع کر دیئے۔ مَیں نے اُنہیں کہا مولوی صاحب سے بات کریں۔ مرہمِ عیسیٰ صاحب نے اعتراض کیا۔ مولوی صاحب نے جواب دیا۔ انہوں نے پھر اعتراض کیا جس کا مولوی صاحب نے کچھ جواب دیا لیکن مرہمِ عیسیٰ صاحب نے پھر اعتراض کیا۔ اِس کا جواب دینے پر وہ مولوی صاحب کہنے لگے ''تُو بڑا چالاک ہے تینوں گلاّں بڑیاں آندیاں ہیں''۔ آخر اِس کام کو مجھے خود سنبھالنا پڑا اور مَیں نے مرہمِ عیسیٰ صاحب سے کہا کہ آپ ادھر آئیں اور مجھ سے بات کریں۔ پس اگر علم آتا ہے تو اس کا استعمال کرنا بھی ضروری ہے اور اِستعمال کا وقت ۱۵، ۱۶ سال کی عمر میں شروع ہو جاتا ہے لیکن جو طریق اب جاری ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم ۲۵، ۳۰ سال کی عمر میں میدانِ عمل میں کُودے۔ جنگ میں ۱۵، ۱۶ سال کا ایک ریکروٹ لیا جاتا ہے لیکن ہمارا نوجوان ۲۵، ۳۰ سال کی عمر میں جا کر اگر سپاہی بنے گا تو اِس نے لڑنا کیا ہے۔

تیسری چیز ایثار ہے۔ پہلی وہ چیزیں ایسی تھیں جو ذاتی خوبیاں تھیں لیکن جب قومی طور پر کام کرنا پڑتا ہے اُس وقت اگر وہ ایسا نہ بنے کہ اِرد گرد کے لوگوں کے ساتھ مل کر کام کر سکے تو اِس کے لئے دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرنا ناممکن ہو جاتا ہے اور وہ قوم کے لئے مفید وجود نہیں بن سکتا۔ اگر گاڑی کے دو گھوڑے اکٹھا زور نہ لگائیں بلکہ ان میں سے ایک ایک طرف زور لگائے اور دوسرا دوسری طرف تو گاڑی چل نہیں سکتی بلکہ گاڑی ٹوٹ جائے گی۔ گاڑی کو چلانے کے لئے ضروری ہے کہ دونوں جانور ایک ساتھ زور

لگائیں اور پر ایک ہی سمت کو چلیں۔ اسی طرح وہی افراد قومی حصہ بن سکتے ہیں جن کے اندر قومی کیریکٹر پایا جائے اور بہترین قومی کیریکٹر ایثار ہے۔ ایثار کے معنی ہیں دوسروں کو اپنے اوپر مقدم کرنا۔ جب کسی قوم کے افراد دوسروں کو اپنے اوپر مقدم کرنے لگ جاتے ہیں تو وہ قوم کے لئے مفید وجود بن جاتے ہیں۔ اور جب کوئی فرد صرف اپنے حق کے حصول میں لگا رہے اور دوسرے کے لئے اپنے حق کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہو تو وہ قوم کے لئے مفید وجود نہیں بن سکتا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لفظِ ایثار استعمال کر کے مسلمانوں کو ایک غیر متناہی جھگڑے سے بچا لیا ہے۔ اگر آپ یہ فرماتے کہ تم دوسروں کا حق نہ مارو ہاں اپنے حق کو حاصل کرنے کے لئے ہمیشہ کوشش کرو تو بہت سے لوگ لُوٹ کھسوٹ کا نام ہی حق سمجھ لیتے اور کہتے کہ یہ ہمارا حق ہے اس لئے ہم اسے حاصل کر کے رہیں گے اور ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی ہوشیاری سے دوسرے کا حق مار لیتے۔ ایک جلسہ پر میں نماز پڑھانے لگا۔ عموماً لوگوں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ نماز میں میرے ساتھ کھڑے ہوں۔ سیٹھ غلام غوث صاحب مرحوم جو حیدرآباد دکن کے رہنے والے تھے نہایت مخلص احمدی تھے۔ ان کے بیٹے سیٹھ محمد اعظم صاحب بھی نہایت مخلص نوجوان ہیں اور جماعت حیدرآباد دکن کے سیکرٹری مال ہیں۔ سارا خاندان ہی مخلص ہے۔ ان کا وطن قادیان سے ہزار بارہ سَو میل کے فیصلہ پر ہے۔ وہ جب جلسہ پر آتے تو نماز میں میرے ساتھ کھڑے ہوتے تا کہ انہیں دعائیں کرنے کا زیادہ موقع مل سکے۔ اِس جلسہ کے موقع پر بھی وہ میرے ساتھ کھڑے تھے کہ گجرات کے ایک احمدی آگے بڑھے اور اُنہیں پیچھے دھکیل کر کہنے لگے آپ لوگوں کو تو یہ موقع روز ملتا ہے ہم لوگ دُور سے آتے ہیں ہمیں بھی حضور کے ساتھ کھڑا ہونے کا موقع دیں۔ اب گجرات قادیان سے ۷۰، ۸۰ میل پر واقع ہے اور حیدرآباد (دکن) اور قادیان کے درمیان ہزار بارہ سَو میل کا فاصلہ ہے لیکن اُنہوں نے بغیر تحقیقات کے اسے اپنا حق سمجھ لیا۔

پس اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرماتے کہ اپنا حق لو، دوسرے کا حق نہ لو تو

سارے لوگ یہ کہتے کہ یہی حق ہمارا ہے۔ اس لئے آپ نے فرمایا دوسرے کے لئے اپنا حق قربان کر دیا کرو اور جب اکثر لوگ ایثار کریں گے تو وہ ظلم سے بچے رہیں گے۔ سَو میں سے ایک آدھ آدمی ایسا ہوگا جس کو اپنا حق دوسرے کے لئے چھوڑنا پڑے۔ باقی سب ایسے ہی ہوں گے جن کا حق نہیں ہوگا اور وہ دوسرے کا حق غصب کرنے سے بچ جائیں گے۔

قوم کا مفید وجود بننے کے لئے یہ روح نہایت ضروری ہے اور جو شخص قوم کا مفید وجود بننا چاہتا ہے ضروری ہے کہ وہ ایثار سے کام لے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں آخری زمانہ میں ایک عظیم الشان فتنہ برپا ہوگا جو سب لوگوں پر چھا جائے گا۔ اُس وقت مومن وہی ہوگا جو ایثار کرے گا اور سمجھے گا کہ قوم کی اصلاح کے لئے ضروری ہے کہ میں اپنا حق چھوڑ دوں اور خلوت اختیار کر لوں۔[۲] اصل بات یہ ہے کہ جب انسانی اخلاق میں تنزل پیدا ہو جاتا ہے تو عام طور پر انسان خواہ مخواہ ہر چیز کو اپنا حق تصور کر لیتا ہے اور ایثار کا لفظ کہہ کر اُسے اِس قسم کی حرکات سے روکا گیا ہے۔ اگر کسی قوم کے افراد میں ایثار کا مادہ نہیں پایا جاتا تو وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی۔ جب حضرت معاویہؓ سے یہ غلطی ہوئی کہ اُنہوں نے اپنے بیٹے یزید کی خلافت کا اعلان کیا تو اُنہوں نے لوگوں کو مدینہ میں اکٹھا کیا اور یزید کے متعلق کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ میرے بعد میرا بیٹا میرا جانشین ہو کیونکہ ایک ایسے خاندان کا فرد ہے جو عرب میں معزز سمجھا جاتا ہے اور پھر اسے خدمت کا موقع مِلا ہے۔ اس لئے ان کا حق ہے کہ خلافت اِنہی کو ملے۔ تمہاری کیا رائے ہے؟ آپ کا یہ مطلب تھا کہ یہ لوگ میری تائید کر دیں گے تردید نہیں کریں گے اور میں یزید کی خلافت کا اعلان کر دوں گا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جو اُس وقت ایمان لائے تھے جب حضرت معاویہؓ کا باپ ابوسفیان کفر کی سرداری کر رہا تھا بلکہ حضرت عمرؓ بھی ابھی ایمان نہیں لائے تھے آپ اُس مجلس میں موجود تھے۔ آپ فرماتے ہیں مَیں پٹکا باندھے بیٹھا تھا جب معاویہ نے کہا ہمارے خاندان کا حق ہے کہ اسے خلافت ملے اور میرا بیٹا مستحق ہے کہ وہ میرے بعد خلیفہ ہو تو مَیں نے چاہا کہ پٹکا کھولوں اور کھڑا ہو کر کہوں کہ بادشاہت کا حق دار وہ ہے

جو اسلام کی تائید میں اُس وقت تلوار چلا رہا تھا جب تمہارا باپ کفر کی سرداری کر رہا تھا لیکن مجھے خیال آیا کہ اس طرح فتنہ کا دروازہ کھُل جائے گا اِس لئے میں نے دوبارہ پٹکا باندھ لیا اور خاموش رہنا ہی بہتر خیال کیا۔

یہ ایثار ہے جو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے یزید کے مقابلہ میں دکھایا۔ آپ کے مقابلہ میں یزید تو کوئی نسبت ہی نہیں رکھتا تھا۔ وہ تو ایک خبیث انسان تھا۔ آپ کے مقابلہ میں ابوسفیانؓ اور حضرت معاویہؓ کی بھی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہ ابتدائی ایمان لانے والوں میں سے تھے اور اُس وقت ایمان لائے تھے جب حضرت عمرؓ بھی ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ آپ جب ایمان لائے تو آپ کی عمر ۱۵ سال کی تھی اور اپنے باپ سے کئی سال قبل آپ ایمان لے آئے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کو اِس قدر عشق تھا کہ بعض اوقات حضرت عمرؓ فرماتے تھے فلاں بات عبداللہؓ سے پوچھ لو۔ کیونکہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کو زیادہ جانتا ہے۔ یعنی آپ کی فضیلت کو حضرت عمرؓ بھی تسلیم کرتے تھے۔ یزید کے مقابلہ میں ان کا حق تو مسلّم تھا لیکن انہوں نے اپنا حق چھوڑ دیا اور کہا میں لوگوں کو فتنہ میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ یزید خلیفہ بنتا ہے تو بننے دو میں کیوں فتنہ کا موجب بنوں۔ لیکن میں کہتا ہوں کاش! حضرت عبداللہ بن عمرؓ اِس موقع پر خاموش نہ رہتے بلکہ بول پڑتے۔ وہ حکومت کے یقیناً حقدار تھے۔ اگر وہ حکومت حاصل کر لیتے تو یقیناً اسلامی حکومت میں جو فوراً تنزّل شروع ہو گیا تھا وہ نہ آتا اور اسلام کی ترقی کا دَور لمبا ہو جاتا۔ ہم حضرت معاویہؓ کی خلافت کے قائل نہیں۔ وہ ایک بادشاہ تھے اور بادشاہ ہونے کے لحاظ سے ایک اچھے بادشاہ تھے۔ اُخروی لحاظ سے وہ صحابی اور نیک آدمی تھے لیکن خلیفہ نہیں تھے۔ اُن کے پاس خلافت آئی نہیں۔ خلافت دو ہی صورتوں میں اُن کے پاس آ سکتی تھی یا تو خدا تعالیٰ اُنہیں خلیفہ مقرر کر دیتا یا مسلمان جمہور اُنہیں خلیفہ منتخب کر لیتے۔ اگر اُنہیں خلیفہ سمجھا جائے تو سوال پیدا ہو گا کہ ان کے پاس خلافت کہاں سے آئی؟ ظاہر ہے کہ نہ اُنہیں خدا تعالیٰ نے خلیفہ مقرر کیا تھا اور نہ جمہور مسلمانوں نے اُنہیں خلیفہ منتخب کیا۔ اس لئے وہ خلیفہ نہیں کہلا سکتے۔ غرض حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے سوچا کہ بنیادی

بادشاہت تو ایک جسمانی چیز ہے روحانی چیز نہیں۔ خدا تعالیٰ نے مجھے روحانی مرتبہ دیا ہے وہ چھوڑ کر مَیں ایک جسمانی چیز کے پیچھے کیوں پڑوں؟ اگر حضرت عبداللہ بن عمرؓ خلافت کی بجائے اِس چیز کو دیکھتے کہ مسلمانوں کی گردنیں کس ہاتھ میں جارہی ہیں تو وہ اِس بارہ میں ایثار نہ دکھاتے اور یہ امر مسلمانوں کے لئے یقیناً خوش قسمتی کا موجب ہوتا۔

دنیا میں یزید کو سب کچھ کہا گیا ہے اور شیعوں نے تو اسے اتنی گالیاں دی ہیں کہ زمین اور آسمان ہِلا دیا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ سب سے بڑی گالی وہ تھی جو خود اس کے بیٹے سے اسے ملی اور وہ اس کا وہ فعل تھا جو اس نے یزید کی وفات کے بعد خلافت قبول نہ کرنے کے بارہ میں کیا۔ میرے نزدیک اِس کا خلافت کو قبول نہ کرنا ایک بہترین گواہی تھی اس امر پر کہ معاویہؓ کا یہ فیصلہ غلط تھا کہ یزید بادشاہت کا مستحق ہے۔ میں حیران ہوں کہ مسلمانوں نے یزید کے بیٹے کی وہ قدر کیوں نہیں کی جس کا وہ حقدار تھا۔ وہ اسلامی شعار کو قائم رکھنے والی اہم ہستیوں میں سے ایک تھا۔ یزید کے بعد شاہی خاندان کے افراد نے اُسے بادشاہ بنا دیا اور اعلان کر دیا کہ یزید کے بعد اُس کا بیٹا خلیفہ ہوگا۔ یہ لوگ اگرچہ بادشاہ ہوتے تھے لیکن کہلاتے خلیفہ ہی تھے۔ بادشاہ بنانے کے بعد وہ اُسے ایک خاص جگہ لے گئے تا وہ اپنی خلافت کا اعلان کرے اور یہ اعلان کر دیا کہ تمام رؤسا اور خاندان کے لوگ اُس کی بیعت کریں۔ وہ اُسے پبلک میں لے آئے اور اُسے اعلان کرنے کے لئے کہا۔ اُس نے ممبر پر کھڑے ہو کر جو اعلان کیا وہ یہ تھا کہ اے لوگو! خدا تعالیٰ نے بادشاہت کا حق تمہیں دیا ہے اور اسلام نے بھی تمہیں اختیار دیا ہے کہ جسے چاہو بادشاہ بنا لو لیکن اِن لوگوں نے مجھ سے پوچھے بغیر یہ رسّی میرے گلے ڈال دی ہے اور جن کا حق تھا اُنہیں پوچھا ہی نہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ اِس مجلس میں وہ لوگ موجود ہیں جو اپنی ذات میں مجھ سے اچھے ہیں، جن کے باپ میرے باپ سے اچھے ہیں اور جن کے دادے میرے دادا سے اچھے ہیں اُن کی موجودگی میں میرا بادشاہت کو قبول کرنا مشکل امر ہے اِس لئے میں یہ رسّی گلے سے اُتار کر پھینکتا ہوں۔ تمہارا حق ہے جن کو چاہو بادشاہ بنا لو۔[۳] اُس کی ماں کو جب یہ اطلاع ملی تو اس نے منہ پر تھپڑ مار کر کہا کہ کم بخت! آج تُو نے اپنے

باپ دادا کی ناک کاٹ دی ہے۔ اُس نے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور کہا ماں! میں نے اپنے باپ دادا کی ناک کاٹی نہیں بلکہ کٹی ہوئی ناک جوڑ دی ہے۔ یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلا گیا اور ایک کمرہ میں داخل ہو گیا اور اُس کا دروازہ بند کر دیا۔ سارا خاندان اُس کا دشمن ہو گیا۔ وہ اُس کمرہ سے باہر نہ نکلا یہاں تک کہ ۴۰ دن بعد اُسی کمرہ میں وہ فوت ہو گیا۔ وہ اسلامی تاریخ کا ایک شاہکار تھا۔ وہ اسلامی تأثیر کا ایک جوہر تھا جو لوگوں کے دلوں میں گھر کر گیا۔ لوگ بادشاہت کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ذلیل ہوتے ہیں لیکن اُس نے بادشاہت کو چھوڑا اور ذلیل ہوا۔ وہ اِس لئے ذلیل ہوا کہ جو مال اُس کے باپ نے چُرایا ہوا تھا اُسے پھینکنے کے لئے اُس نے لڑائی کی۔

غرض ایثار بہت بڑی چیز ہے اور اس کے بغیر قومیں نہیں بنتیں۔ جن لوگوں میں ایثار نہیں پایا جاتا اور وہ ہمیشہ یہ کہتے رہتے ہیں کہ یہ میرا حق تھا، یہ میرا حق تھا وہ اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ قوم نہیں بناتے۔ قوم وہ لوگ بناتے ہیں جنہیں یقین ہو جاتا ہے کہ یہ ہمارا حق ہے لیکن پھر بھی اپنا حق دوسرے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ مگر یاد رکھو عزتِ نفس بھی ضروری چیز ہے۔ دوسرے کے سامنے لجاجت کرنا اور اُس کی منت خوشامد کرنا نیکی پیدا نہیں کرتا۔ نیکی اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب دشمن دیکھتا ہے کہ ہم میں غیرت موجود ہے اور غیرت کی وجہ سے ہم اُس کے سامنے جھکنے کو تیار نہیں لیکن پھر بھی ہم اپنا حق چھوڑ دیتے ہیں اِس سے وہ متأثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ لیکن اگر تم اصرار کرتے ہو تو وہ سمجھے گا یہ ایثار نہیں بلکہ اِس میں اِس کا کوئی فائدہ مخفی ہے۔

چوتھی چیز اخلاق میں مطمحِ نظر کا اونچا کرنا اور اسے اونچا کرتے چلے جانا ہے۔ جب کبھی انسان کسی کام کے لئے اُٹھتا ہے تو اُس کی دو حالتیں ہوتی ہیں۔ یا تو وہ کامیاب ہوتا ہے یا ناکام ہوتا ہے۔ جب وہ ناکام ہوتا ہے تو اس کا کام باقی ہوتا ہے اور وہ اس کو پورا کرنے کے لئے دوبارہ کوشش کرتا ہے۔ اگر وہ پھر ناکام ہوتا ہے تو وہ سہ بارہ کوشش کرتا ہے۔ لیکن اگر وہ کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ اپنی جگہ پر پہنچ جاتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ساکن ہو جاتا ہے اور جب وہ ساکن ہو جاتا ہے تو تنزّل کی طرف چلا جاتا ہے۔

گویا جو فیل ہو جاتا ہے وہ کوشش کرتا ہے تا دوبارہ کامیاب ہو جائے لیکن جو کامیاب ہو جاتا ہے وہ ساکن ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے سامنے تگ و دَو کا میدان نہیں رہتا۔ اسلام اسے جائز قرار نہیں دیتا۔ اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے غیر متناہی ترقیات کا سلسلہ کُھلا رکھا ہے اور جب اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے غیر متناہی ترقیات کا سلسلہ کُھلا رکھا ہے تو کوئی ترقی ایسی نہیں ہوسکتی جس کے آگے ترقی کرنے کا مقام نہ ہو۔ انسان کو ہمیشہ اپنا پروگرام بدلتے رہنا چاہیئے۔ جوہڑ کے پانی کی طرح ساکن ہو جانا قوم کے لئے مفید نہیُں ہوتا۔ کھڑا پانی سڑ جاتا ہے اور اُس میں بدبو پیدا ہو جاتی ہے۔ اِسی طرح اگر کسی قوم کے افراد ایک جگہ پر پہنچ کر ساکن ہو جاتے ہیں تو وہ قوم ترقی نہیں کرسکتی۔

پس مطمحِ نظر کا اونچا کرتے چلے جانا قومی ترقی کے لئے نہایت اہم ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں نِیَّۃُ الْمُؤْمِنِ خَیْرٌ مِّنْ عَمَلِہٖ [۴] مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہوتی ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا فقرہ ہے لیکن اپنے اندر ایک بہت بڑا مُدعا لئے ہوئے ہے۔ مومن کی نیت ہمیشہ اُس کے عمل سے بہتر ہوگی۔ اِس کے دو معنے ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ انسان کی نیت بھی اچھی ہو اور اُس کے اعمال بھی اچھے ہوں لیکن اُس کا ارادہ یہ ہو کہ وہ پہلے سے بڑھ کر نیک اعمال کرے گا۔ دوسرے یہ کہ اُس کی نیت اچھی ہو لیکن اعمال بُرے ہوں اور ارادہ یہ ہو کہ وہ اپنی اصلاح کرے گا اور پھر جُوں جُوں وہ کام کرتا جائے اپنی نیت کو بھی بلند کرتا جائے۔ جب وہ ایک روزہ رکھتا ہے تو اس کے بعد دوسرا روزہ رکھتا ہے، پھر تیسرا روزہ رکھتا ہے۔ جب وہ ایک دن روزہ رکھتا ہے اور اُس کی شام قریب آتی ہے تو وہ دوسرے روزے کی نیت کرتا ہے اور جب تیسرے روزے کی شام قریب آتی ہے تو وہ چوتھا روزہ رکھتا ہے اور یہ ارادہ رکھتا ہے کہ کوئی دوسری نیکی کروں۔ مثلاً صدقہ دوں اور جب وہ صدقہ کرتا ہے تو کسی اَور نیکی کی نیت کر لیتا ہے اِس طرح اُس کی نیت عمل پر سبقت لے جاتی ہے۔

غرض انسان کا ارتقائی پروگرام ہونا چاہیئے جو اونچے سے اونچا ہوتا چلا جائے۔ خدا تعالیٰ کی قدرت دیکھو کہ پہلے ایک چھوٹا پہاڑ ہوتا ہے پھر اُس سے بڑا پہاڑ ہوتا ہے،

پھر اُس سے بڑا پہاڑ ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ انسان اُس کی چوٹی پر چلا جاتا ہے۔ تم کبھی یہ نہیں دیکھو گے کہ انسان ایک ہی دفعہ کسی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جائے۔ یہی وہ انسان سے امید رکھتا ہے کہ جب وہ ایک نیکی کرے تو پھر اس سے بڑی نیکی کرے، پھر اس سے بڑی نیکی کرے۔ اور کامیاب وہی انسان ہوتا ہے جو ایک جگہ پر ساکن نہ ہو جائے بلکہ جب وہ ایک مقصد کو حاصل کر لے تو اُس سے بڑے مقصد کے حصول کے لئے کوشش کرنے لگ جائے۔ وہ ایک چھوٹی نیکی کر کے ٹھہر نہیں جاتا بلکہ وہ ہر روز ایک نیا پروگرام تیار کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ پہلے سے آگے نکل جاؤں۔ اور جب کوئی انسان اِس قسم کا پروگرام تیار کرتا ہے تو یقیناً اُس کا فکر ترقی کرتا ہے، اُس کا عمل وسیع ہوتا ہے اور ہر کامیابی پر اُس کا حوصلہ بھی وسیع ہوتا ہے۔ اِس وقت میں ان چار نصائح پر تقریر ختم کرتا ہوں۔ نصائح تو اَور بھی ہیں لیکن بہر حال میں نے اپنی تقریر ختم کرنی ہے۔ چاہئے کہ تم یہ چاروں باتیں ہمیشہ اپنے مدنظر رکھو۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ تم سچ بولو بلکہ میں نے کہا ہے کہ تم ایسے دوست بناؤ جو ہمیشہ سچ بولیں۔ میں نے کہا ہے کہ تم محنت کی عادت ڈالو۔ اپنے اندر قربانی اور ایثار کا مادہ پیدا کرو۔ اپنے مطمحِ نظر کو اونچا رکھو۔ یہاں تک کہ مطمحِ نظر ہمیشہ بلند سے بلند تر ہوتا چلا جائے۔"

(روزنامہ الفضل ربوہ مؤرخہ ۲۷، ۲۸، ۲۹/ اپریل ۱۹۶۱ء)

۱؎ آل عمران: ۵۴

۲؎ المعجم الکبیر جلد ٦ صفحه ٦٠ مکتبة العلوم و الحکم الطبعة الثانیۃ ۱۹۸۳ء

۳؎ تاریخ ابن اثیر جلد ۴ صفحہ ۱۳۰۔ مطبوعہ بیروت ۱۹۶۵ء

۴؎ المعجم الکبیر جلد ٦ صفحہ ۲۲۸ مطبوعہ بغداد ۱۹۷۹ء کے مطابق یہ حدیث ضعیف ہے۔